© rasailojaraid.com

مباحثہ ومکالمہ

مکاتیب

(۱)

عزیز گرامی عمار خان ناصر، مدیر ''الشریعہ''

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

گزارش ہے کہ غامدی صاحب کے تصور حدیث وسنت کے عنوان سے آپ کے والد گرامی حفظہ اللہ کے جو دو مضمون الشریعہ میں چھپے تھے، جس کے جواب میں غامدی صاحب نے ایک وضاحتی مضمون تحریر کیا تھا جو الشریعہ ہی میں چھپا ہے، اس میں غامدی صاحب نے دعویٰ کیا ہے کہ :

''اس بارے میں میرے اور ائمہ سلف کے موقف میں سرمو فرق نہیں ہے۔''

راقم کے خیال میں موصوف کا یہ دعویٰ سراسر بے بنیاد ہے۔ ان کے اور ائمہ سلف کے موقف میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اسی دعوے کے تناظر میں راقم نے غامدی صاحب کے نظریات پر نقد ومحاکمہ کیا ہے۔ غامدی صاحب کا محولہ دعویٰ بھی ''الشریعہ'' میں چھپا ہے، اس لیے اصولی طور پر اس پر نقد ومحاکمہ والا مضمون بھی اسی میں چھپنا چاہیے۔ علاوہ ازیں مذہبی رسائل میں ''الشریعہ'' ہی وہ واحد پرچہ ہے جس کے مباحثہ ومکالمہ والے حصے میں مختلف آراء رکھنے والوں کے مضامین کو احقاق حق کے نقطہ نظر سے شائع کیا جاتا ہے۔ اس لیے راقم کی بجا طور پر یہ خواہش ہے کہ راقم کا یہ مضمون قسط وار ''الشریعہ'' ہی میں چھپے۔ اس کا جواب بھی بلاشبہ آپ شائع کریں، لیکن جواب کسی نمبر ۲ کا نہ ہو، خود غامدی صاحب کا ہو۔ مضمون قدرے طویل ہے، ۱۰۰ صفحات سے زیادہ۔

جواب آنے پر مضمون ارسال کر دیا جائے گا۔ ان شاء اللہ

صلاح الدین یوسف
گڑھی شاہو۔ لاہور

(۲)

گرامی قدر جناب مولانا حافظ صلاح الدین یوسف صاحب زید مجدہم

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

والد گرامی کے بدست آپ کا عنایت نامہ موصول ہوا تھا۔ جواب میں چند دن کی تاخیر ہوئی جس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔

غامدی صاحب کے موقف پر اپنا نقد ضرور ارسال فرما دیں۔ مضمون کی طوالت بعض پہلوؤں سے قارئین کے لیے مشکل کا باعث ہوگی، کیونکہ زیادہ اقساط کی صورت میں بحث کا سرا تلاش کرنا شاید عام قارئین کے لیے ممکن نہیں ہوتا، اس لیے اگر اہم نکات کی تلخیص ہو جائے جو دو تین اقساط میں مکمل ہو سکے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ بہرحال یہ آپ کی صواب دید ہے۔ اگر آپ مفصل صورت میں ہی اشاعت ضروری تصور کرتے ہیں تو ایسا ہی کیا جائے گا، ان شاء اللہ۔

جہاں تک جوابی موقف کے، خود غامدی صاحب کے تحریر کردہ ہونے کی شرط کا تعلق ہے تو بطور مدیر ہم ایسی کوئی پابندی کسی بھی فریق بحث پر عائد نہیں کر سکتے۔ جب بحث چھیڑی جاتی ہے تو کوئی بھی صاحب قلم اس میں حصہ لے سکتا ہے، البتہ اسے قبول کرنا یا نہ کرنا اور وزن دینا یا نہ دینا آپ کا حق ہے۔

نیک دعاؤں میں یاد فرمایئے۔ والسلام

محمد عمار خان ناصر

(۳)

عزیز گرامی جناب عمار خان ناصر سلمک اللہ تعالیٰ

وعلیکم السلام ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

آپ کا مکتوب گرامی موصول ہوا۔ یہ امر باعث مسرت ہے کہ آپ نے اس مقالے کی اشاعت کو منظور فرما لیا ہے۔ جزاک اللہ احسن الجزاء۔

اس سلسلے میں چند مزید گزارشات پیش خدمت ہیں۔ امید ہے آپ ان کو بھی ضرور ملحوظ رکھیں گے۔

۱۔ اختصار اگر ممکن ہوتا تو ایسا کیا جا سکتا تھا، لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ اس لیے جتنے بھی صفحات آپ ہر ماہ اس کے لیے مختص کر سکتے ہیں، اسے قسط وار شائع فرما دیں۔ تاہم درمیان میں تعطل نہ ہو۔

۲۔ مضمون میں آپ کو متعدد جگہ تکرار بھی محسوس ہوگی۔ اسے آپ مولویوں والی سلیقہ گفتار کی کمی سمجھ لیں کیونکہ اس کا قلم کار بھی بہرحال فرزند تہذیب نہیں، ابلہ مسجد ہی ہے۔ راقم کے خیال میں یہ تکرار بھی ناگزیر ہے۔ بنا بریں گرانی طبع کے باوجود آپ اسے برداشت کر لیں تو مزید احسان ہوگا کہ اس تکرار میں بہتوں کا بھلا ہے۔ ان شاء اللہ

۳۔ یہ تنقیدی مضمون ہے، مدحت نگاری نہیں ہے۔ تنقید اور مدحت دونوں کا اسلوب اور لب ولہجہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ جن صاحب کے افکار وخیالات کو نقد ونظر کا موضوع بنایا گیا ہے، وہ آپ کے استاذ بھی ہیں اور ممدوح بھی اور اس پر مستزاد ان کے افکار سے متاثر اور ان کے وکیل صفائی بھی۔ اس لیے اگرچہ حتی الامکان حد ادب کو ملحوظ رکھا گیا ہے، تاہم بعض جگہ آپ اس میں کچھ تجاوز بھی محسوس کریں تو آپ سے گزارش ہے کہ آپ اسے بھی گوارا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریں کہ : زہر بھی کرتا ہے کبھی کارِ تریاقی۔

۴۔اور اس کی وجہ یہ ہے کہ غامدی صاحب کا موقف جیسا کچھ ہے، اس کی حیثیت ایک علمی اختلاف کی قطعاً نہیں ہے بلکہ وہ مسلمات اسلامیہ کے منکر ہیں اور ائمہ سلف کے موقف سے یکسر مختلف اور منحرف۔ اور اس پر دعویٰ یہ ہے کہ ان کے اور ائمہ سلف کے موقف میں سر مو فرق نہیں ہے، صرف الفاظ کا فرق ہے یا اصطلاحات کا۔

ائمہ سلف کے منہج وفکر کو سمجھنے والا اتنے بڑے جھوٹ اور ادعا کو کس طرح ہضم کر سکتا ہے؟ یہ قطعاً ناممکن ہے، اس لیے اس کے جذبات کا ارتعاش میں آنا ایک فطری امر ہے۔ اس لیے کہیں کہیں لب ولہجہ کی تندی ایک صحیح الفکر مسلمان کے جذبات کی آئینہ دار ہے، بالخصوص جب کہ اس کی صدائے احتجاج ہی فکر ونظر کی نامسلمانی کے خلاف ہو۔

والد گرامی قدر حفظہ اللہ کی خدمت میں نیاز مندانہ سلام۔

(حافظ) صلاح الدین یوسف

مدیر شعبہ تحقیق وتالیف، دار السلام لاہور

(۴)

الشریعہ، نومبر ۲۰۱۴ء کے مکاتیب میں جناب مولانا زاہد الراشدی کے لیے جناب مولانا عتیق الرحمٰن سنبھلی کا یہ ارشاد دیکھ کر کہ ''اوج صاحب قابل توجہ ہی نہ تھے جبکہ آپ کی تحریر سے پتہ چلا کہ وہ تو بڑی ذی علم ہستی تھی''، راقم کی توجہ ادھر ادھر بھٹکنے لگی اور ایک ایسی وادی میں جا نکلی جو بڑی ہی حساس، پرخطر اور پُر خار ہے اور وہ ہے ''اکابرین'' سے اختلاف اور ان کی جناب میں لب کشائی کی وادی۔ خیر! میں اس وادی پر خار میں آنے والا پہلا آبلہ پا بھی نہیں اور اس وادی میں کانٹوں کی زبان اب اتنی سوکھی ہوئی بھی نہیں رہی۔

میرے ذہن سے کئی دنوں سے یہ خیال چپکا ہوا ہے کہ لوگوں کو قابل توجہ یا نا قابلِ توجہ ٹھہرانے سے متعلق ہمارے پیمانے کتنے عجیب ہیں! اکابر کا قصیدہ خواں ہو، اکابر سے منسوب کسی دار العلوم کا مہتمم ہو، اپنے رسائل وجرائد میں اکابر کے ارشادات پر آمنا وصدقنا کہنے اور ان کو وحی آسمانی کی طرح quote کرنے والا ہو تو چاہے علمی دنیا میں کتنا ہی ناکردہ کار ہو، نہ صرف قابل توجہ ہے بلکہ خود اکابرین کی فہرست میں شامل ہونے کے لائق ہے، لیکن جس میں یہ ''اہلیت'' نہیں، وہ کتنی ہی محنت کر دے، کتنی جان جوکھوں میں ڈال لے، قرآن وسنت اور سیرتِ پیغمبر آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم پر کتنا ہی تدبر کر کے کتنے ہی گوہر ہائے معانی نکال لائے، یکسر نا قابلِ توجہ ہے۔

اگر کسی صاحبِ جبہ ودستار کے سینکڑوں ہزاروں شاگرد ہوں تو خواہ حضرت نے تحقیق کی وادی میں قدم تک نہ رکھا ہو، شاگردوں کی عصبیت ہی اسے تا قیامت زندہ اور قابل توجہ رکھنے کے لیے کافی ہے۔ لیکن جو کسی دار العلوم کی ملکیت اور بڑی پگڑی کی اہلیت سے محروم ہو، اس کے سینکڑوں ہزاروں شاگرد بھی ہوں اور وہ بساط بھر دادِ تحقیق بھی دیتا رہا ہو، ہرگز قابلِ توجہ نہیں۔ دراصل مسئلہ اس نفسیات کا ہے جو مخصوص حلقہ تعلیم وتدریس اور درس ومدرسے کی فضا سے باہر نہ کسی کو استاد ماننے کو تیار ہے نہ شاگرد اور نہ دین کا محقق وطالب علم۔ مولانا زاہد الراشدی نے اس نفسیات کا تجزیہ کرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اس کے شکار اربابِ مدرسہ کو اصلاحِ احوال کی دعوت دیتے ہوئے خوب لکھا تھا کہ:

''بد قسمتی سے ہم نے ایک بات کم وبیش حتمی سمجھ رکھی ہے کہ ہمارے روایتی حلقوں سے ہٹ کر کوئی بھی شخص یا ادارہ کوئی علمی یا دینی بات کرتا ہے تو وہ یقیناً گمراہی پھیلاتا ہے اور ہم نے اسے بہر حال مخالف کیمپ میں ہی دھکیلنا ہے۔۔۔ یہ انتہائی پریشان کن صورت حال ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ ہمیں اس پر نظر ثانی کرنی چاہیے، غیر روایتی علمی حلقوں کے حوالے سے ترجیحات قائم کرنی چاہییں اور جہاں افہام وتفہیم سے کام لینا ممکن ہو، اسے موہوم گمراہی کی نذر کر دینے کے بجائے قابلِ قبول غیر روایتی حلقوں سے استفادہ کی صورتیں نکالنی چاہییں۔''

''تحقیق ومطالعہ کا جدید اسلوب، طریق کار، ذرائع اور بین الاقوامی سطح کے علمی وتحقیقی اداروں کے کام اور طرز سے استفادہ دینی مدارس کے نزدیک ابھی تک شجرِ ممنوعہ کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کی وجہ صرف بین الاقوامی زبانوں سے ناواقفیت نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ساتھ یہ ذہنی اور نفسیاتی کیفیت بھی اس کا باعث ہے کہ ہمیں دنیا کے دیگر تمام حلقوں پر علمی اور فکری برتری حاصل ہے اور ہمیں کسی دوسرے حلقہ کے علمی کام سے واقف ہونے اور اس سے استفادہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔''

''دینی مدارس میں عالم اسلام کے علمی حلقوں کی تحقیقات، دوسرے مسالک کے علمی کام اور غیر روایتی علمی مراکز کی تحقیقی مساعی سے استفادہ کو اپنی نفسیاتی برتری کے منافی تصور کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ بُعد اور فاصلہ قائم رکھنے کو بھی تحفظاتی حکمت عملی کا ایک ناگزیر حصہ بنالیا گیا ہے۔''

ستم ظریفی دیکھیے کہ وہ لوگ قابلِ توجہ ہیں جن کے افکار کا مطالعہ تحصیلِ حاصل سے زیادہ اہمیت نہ رکھتا ہو اور وہ ناقابلِ توجہ جنھوں نے قرآن وسنت میں تدبر کر کے دلیل کی بنیاد پر مختلف رائے اختیار کی ہو، حالانکہ فی الواقع قابلِ توجہ تو موخر الذکر ہیں۔ فرض کریں تحقیق کا ذوق آشنا ایک شخص نہ اوج صاحب سے نام کو واقف ہے اور نہ مولانا سنبھلی سے۔ اس کے سامنے ان دونوں کے جملہ افکار باندیوں سے متعلق ان کے مضامین ہیں، جن میں سے مولانا سنبھلی کے مضمون میں یہ کہا گیا ہے کہ باندیوں سے بلا نکاح تمتع کا سلسلہ طلوعِ اسلام کے بعد بھی جاری رہا اور رہ سکتا ہے، اور یہ قرآنی تعلیمات کے عین مطابق ہے، اور اوج صاحب کے مضمون میں کہا گیا ہے کہ زن وشو کا تعلق ملکیت کی بنیاد پر درست نہیں، ملکِ یمین سے مراد فقط وہ عورتیں ہیں جن کو قبل از اسلام غلامی وراثت میں ملی تھی، اور دونوں اپنے اپنے موقف کے حق میں کتاب وسنت سے دلائل پیش کرتے ہیں، تو اس کے نزدیک غور وفکر کو مہمیز دینے کے پہلو سے کون زیادہ قابلِ توجہ ہوگا؟ ظاہر ہے کہ موخر الذکر، اس لیے کہ اول الذکر نے جو بات کہی ہے، وہ ان کا حاصلِ مطالعہ وتدبر نہیں، بیسیوں لوگ ان سے پہلے یہ بات کہہ چکے ہیں۔

قرآن وسنت کی دلیل کی بنیاد پر کہی گئی بات ناقابلِ توجہ کیسے ہوسکتی ہے! اوج صاحب کا استدلال ہے کہ جنگی قیدیوں کو غلام، جانور اور لونڈی بنانا قرآن حکیم کی تعلیمات سے میل نہیں کھاتا۔ یہ ارشاد خداوندی فَاِمَّا مَنًّا بَعدُ وَاِمَّا فِدَآءً کے خلاف ہے۔ وہ قرآن کی متعدد آیات کا حوالہ دے کر واضح کرتے ہیں کہ لونڈیوں سے تمتع نہیں، نکاح

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چاہیے۔ وہ کہتے ہیں کہ وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ میں ملکِ یمین سے مراد ملک نکاح ہے، نہ کہ وہ عورتیں جو جنگ میں قید ہو کر ملکِ یمین ہو جائیں۔ قرآن کریم کے مَا مَلَکَتْ اَیْمَانُھُمْ کا تعلق ماضی کی باندیوں سے ہے، اسی لیے ہمیشہ اس ضمن میں صیغہ ماضی استعمال کیا گیا ہے۔ اس اسلوب سے قرآن نے موروثی غلامی کو ختم کیا ہے، نہ کہ اسے جاری رکھنے کا اعلان کیا ہے۔ اگر محض ملکیت کی بنا پر مباشرت کا حق تسلیم کر لیا جائے تو مالک ہی نہیں، مالکہ کو بھی یہ حق دینا پڑے گا۔ اوج صاحب کے مطابق یہ بات تاریخی حقائق کے خلاف ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماریہ قبطیہ سے تمتع کیا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ دائرہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد آپ کے نکاح میں آئی تھیں، جیسا کہ آپ نے ریحانہ، بریرہ اور صفیہ رضی اللہ عنہن کو آزاد کر کے ان سے نکاح کیا تھا۔

اوج صاحب کے اس استدلال سے اختلاف ہو سکتا ہے اور اسے دلیل کی بنیاد پر رد بھی کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بات سے کیسے انکار کیا جا سکتا ہے کہ انہوں نے اپنے مقدمے کو کتاب وسنت کے دلائل پر استوار کیا ہے۔ کتاب وسنت کے دلائل کی بنیاد پر کہی گئی منفرد بات تردید کے لیے ہی سہی، کم از کم قابل توجہ تو مانی جانی چاہیے۔ اگر کسی ایک مسئلے یا چند مسائل میں کسی کی منفرد رائے اسے نا قابلِ توجہ اور نا اہل ثابت کر دیتی ہے تو سلف میں کوئی ایک عالم بھی اہل اور قابل توجہ نہیں بچتا۔ ذرا کسی ایک نمایاں عالم کو نام تو لیجیے جس نے کسی بھی معاملے میں جمہور سے ہٹ کر رائے اختیار نہ کی ہو! علما کے تفردات ایک مسلمہ ہیں۔ لیکن کیا کیجیے کہ اس حقیقت کے باوجود کسی کے نئے یا شاذ نوعیت کے حاصل تدبر کو اجماعی موقف سے انحراف قرار دے کر یکسر نا قابل اعتنا قرار دے دیا جاتا ہے۔ یہ اجماعی موقف ایک ایسا ''ہوا'' ہے جس کے ذریعے لوگوں کو غور وتدبر سے ڈرایا جاتا اور ابوابِ فکر پر پہرہ بٹھایا جاتا ہے۔ یہ بات بجائے خود بحث طلب ہے اور علما کے ہاں اس پر بحث ہوتی آ رہی ہے کہ اجماعی موقف کیا ہوتا ہے؟ جن جن مسائل کو اجماعی کہا جاتا ہے، وہ کس حد تک اجماعی ہیں؟ کیا کوئی اجماعی مسئلہ کبھی غیر اجماعی بھی ہو سکتا ہے؟ ایک زمانے کے اجماع کو دوسرے زمانے کا اجماع کالعدم بھی کر سکتا ہے؟ جب اجماع سے متعلق اس قدر بنیادی امور زیرِ بحث یا بحث طلب ہوں تو یہ سوال کیوں نہ اٹھے کہ کون سے اور کس اجماع سے کیا انحراف؟

اکابر کا ڈر بھی کیا چیز کیا ہے، خود اکابرین کو بھی سہما دیتا ہے اور وہ اچھے بھلے ''بہادر'' ہونے کے باوجود معذرت خواہی پر اتر آتے ہیں۔ مولانا سنبھلی کے زیر نظر خطوط کے بعد جناب مولانا زاہد الراشدی کا جو خط شائع ہوا ہے، اس کے بین السطور اس کی ایک جھلک دیکھی جا سکتی ہے۔ وہ صاف دباؤ میں نظر آتے ہیں۔ اوج صاحب سے متعلق جناب کا یہ ارشاد کہ ''وہ دینی وعصری علوم پر گہری نظر رکھتے تھے، آج کے دور کے تقاضوں کو سمجھتے تھے اور ان کی روشنی میں نئی نسل کی رہنمائی کے اسلوب سے بہرہ ور تھے'' ان کو کوئی علم کا ہمالیہ دکھانے والی بات نہ تھی کہ ایسی عنایت تو علما کی جانب سے کئی انتہائی معمولی علم کے اربابِ دستار پر بھی ہوتی رہتی ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی پسپائی اختیار کر گئے ہیں جس کا ثبوت اجماعی موقف سے انحراف کو درست نہ سمجھنے اور اوج صاحب کو بریلوی مکتبِ فکر کا بندہ (حالانکہ وہ اپنی بہت سی تحریروں میں بریلوی مکتب فکر سے زیادہ دیوبندی مکتب فکر کا بندہ لگتے تھے) اور ان لوگوں میں سے ایک آدمی شمار کرنے ''جن کا

© rasailojaraid.com